زمین

ساری زندگی ہوگئی چودھری صاحب آپ کی خدمت کرتے۔ نہ تو میری حالت بدلی اور نہ ہی آپ کی عادت۔ خدمت کا نشہ ہوگیا ہے۔ روٹی ملے نہ ملے۔ خوشامد کی چوپڑی سے ہی پیٹ بھر لیتا ہوں۔

ساری زندگی ہوگئی تجھے اس گھر سے کھاتے۔ نہ تو تیرا پیٹ بھرا اور نہ ہی نظر۔ خدمت کرتا ہے تو اجرت بھی تو لیتا ہے۔ کون سا احسان کرتا ہے۔ چل اَب بولنا بند کر اور پاؤں دبانا شروع کر۔

کبھی سوچتا ہوں چودھری صاحب، اگر میری بھی آپ کی طرح اتنی زمین ہوتی تو میں بھی نوکر چاکر رکھتا، عیش سے رہتا، حکم چلاتا، بات بے بات بے عزتی کرتا۔

بس کر شیخ چلی کی اولاد۔ اَب ایک لفظ اور بولا تو یہاں سے نکال دوں گا۔

میں جاؤں گا نہیں صاحب۔اس مقبرے میں میرے سوا آپ کے ساتھ ہے ہی کون۔دولت ہے کہ ٹھاٹھیں مارتی پھرتی ہے اور خرچنے کو کوئی ہے نہیں۔اس جہنم کی آگ کو لوگوں میں بانٹ دو،ٹھنڈی ہو جائے گی۔

بس اَب خاموش ہو جا۔بہت بول لیا تو نے۔

سن لیا کرو صاحب۔اور مانگتا ہی کیا ہوں۔بولو ٹانگیں دباؤں یا بازو؟

ٹانگیں دبا دے۔بس پنڈلی والا حصہ۔آج بہت درد کر رہا ہے۔رحمے کل مسجد میں کس کی فوتگی کا اعلان ہو رہا تھا۔کون مر گیا؟

ماسی جلاں۔ولایت پولی کی بیوہ۔عیدگاہ والی گلی میں رہتی تھی۔

اس کے کفن دفن کا انتظام کیا ہے کسی نے۔

کوئی مسئلہ نہیں سرکار۔اس کا لڑکا سعودی عرب میں ہوتا ہے۔ریال بہت بھیجتا ہے۔بس خود نہیں آتا۔ہر سال اور زمین خرید لیتا ہے۔بڑی عزت ہو گئی ہے ان کی۔اَب کمّی نہیں رہے۔عجیب رنگ ہیں زمانے کے چوہدری صاحب۔جس کی کمائی کی چہل پہل ہے اسے چھٹی نہیں ملتی۔وہ بھی آپ کی طرح کسی خالی کمرے میں اپنی دولت اور ماں کے آخری دیدار کو ترازو میں رکھ کر بیٹھا ہو گا۔دولت کا پلڑا بھاری ہی رہے گا۔ہمیشہ رہتا ہے۔یہ رزق کی تلاش میں پردیس جانے والوں کے ساتھ کچھ

اچھی ہوتی نہیں صاحب۔ لوگ ان کی کمائی کو محنت کی کمائی ہی نہیں سمجھتے اور اسے ضائع کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ان توجہ کے بھوکوں کو بھی شیخی بگھارنے کی ایسی لت پڑ جاتی ہے کہ قرض لے کر مہنگے تحفے لاتے ہیں اور جعلی رعب ڈالتے پھرتے ہیں۔ ظلم تو یہ ہے کہ ماں باپ بھی دیسی بچوں کا ہی ساتھ دیتے ہیں۔ آپ کو افتخار یاد ہے۔ اچھو کمہار کا لڑکا۔ دس سال بعد پچھلے مہینے دبئی سے واپس آیا تھا۔ جب ماں باپ سے پیسوں کا پوچھا تو بیچارے پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ اس کا ایک نکھٹو بھائی ہے۔ اُس نے کسی فراڈیے کے ساتھ کاروبار میں ساری رقم لگا دی۔ شروع میں تو سب اچھا تھا۔ لیکن چھ مہینے کے بعد وہ فراڈیا سارے پیسے لے کر کسی دوسرے ملک فرار ہو گیا۔ بہت نقصان ہوا بیچاروں کا۔ جب یہ بات افتخار کو پتا چلی تو اس نے بہت فریاد کی۔ اس کی ماں نے اسے اپنے ساتھ بٹھایا اور بولی، ''جب تم دونوں چھوٹے تھے اور ہم بہت غریب تھے، ہمارے پاس سب کچھ بہت کم تھا۔ کھانا کھاتے وقت جب میں دیکھتی کہ کسی ایک کی پلیٹ میں سالن کچھ کم ہے تو دوسرے کی پلیٹ سے تھوڑا سا نکال کر پورا کر دیتی۔ رات کو تم دونوں کے پاس ایک ہی کمبل ہوتا تھا۔ میں رات بھر اٹھ اٹھ کر دیکھتی تو جس کے پیر ننگے ہوتے دوسرے سے تھوڑا سا کھینچ کر اس کے پیر ڈھانپ دیتی۔ بس اسی سوچ سے جو کیا سو کیا۔ تیرا بھائی کمزور ہے۔ نیت تو اچھی تھی، نتیجہ اچھا نہیں نکلا۔'' اس کے بعد افتخار نے کچھ نہیں کہا، خاموش ہو گیا۔ سچ کہتے ہیں صاحب، غربت دولت کی نہیں سوچ اور مزاج کی ہوتی ہے۔ اَب سوچیں اگر اس نے انہی پیسوں سے زمین لے لی ہوتی تو دولت بھی محفوظ رہتی اور آج وہ زمیندار ہوتا۔

تو چاہتا کیا ہے رحمے ۔گھوم پھر کر تیری تان وہیں آ کر ٹوٹتی ہے۔

اپنی زمین، اپنی کھیتی، اپنا اناج، زمین تو ماں ہوتی ہے ناں صاحب۔

بد بخت ماں تو ماں ہوتی ہے۔خریدی تھوڑی جاتی ہے۔ پروان چڑھاتی ہے۔ اپنے اناج سے سیراب کرتی ہے اور پھر اپنی آغوش میں سمیٹ لیتی ہے۔اَب تو ماں کی قیمت تھوڑی لگائے گا۔بولنے سے پہلے سوچ لیا کر۔

جب ہم غریب زمین کی آرزو کریں تو آپ کا فلسفہ شروع ہو جاتا ہے۔اور اپنی باری مربعے ہیں کہ ختم نہیں ہوتے۔

اور میں، ان مربعوں کا مالک، بقول تیرے اتنا بے بس ہوں کہ ایک کَمی کو چپ نہیں کروا سکتا۔اپنی پردیسی اولاد کو واپس نہیں لا سکتا۔بس اس عالیشان مقبرے کی حفاظت پر مامور ہوں۔چل جانے دے۔آج کے لیے اتنا ہی بہت ہے۔اَب تو جا۔کل صبح جلدی آ جانا۔ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔

رحماں تھکے قدموں گھر روانہ ہوا۔گلی میں ہوا آوارہ لڑکوں کی طرح سیٹیاں مارتی پھرتی تھی۔کچھ در کھلے تھے، کچھ کو چکوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔کہیں لوہے کے مضبوط کواڑ تھے تو کہیں در تھا ہی نہیں۔مگر لوگ ہر حال میں بس رہے تھے۔زندگی رواں دواں تھی۔

چوہدری اچھا آدمی ہے۔ خیال رکھتا ہے۔ اکیلا رہ رہ کر رحمے کو خود کلامی کی عادت ہوگئی تھی۔ بس زمین نہیں دیتا۔ قبر میں لے کر جائے گا ساری۔ کیوں دے؟ میں اس کا ہوں ہی کون؟ وہ خود سے گویا ہوا۔ ساری زندگی اس کی خدمت کی ہے۔ جب اس کی اولاد بھی چھوڑ گئی تو کس کے کاندھے پر سر رکھ کر رویا ہے۔ اگر میں نہ ہوتا تو.....تو کیا ہوتا؟ کوئی اور ہوتا۔ اور پھر وہ خود ہی مسکرا دیا۔

رحمے کی کہانی اس کی زندگی کی مانند بہت سادہ تھی۔ ماں باپ بچپن میں ہی گزر گئے۔ کچھ نام نہاد زمین کے ٹکڑے تھے جو رشتہ داروں نے مال غنیمت سمجھ کر اینٹھ لیے۔ بیوی شادی کے دوسرے سال زچگی میں اللہ کو پیاری ہوگئی اور جاتے جاتے ایک لڑکا دے گئی۔ لڑکا جوان ہوا تو ولایت چلا گیا۔ مر جاتا تو تسلی ہو جاتی لیکن وہ تو غیروں کا ہی ہوگیا۔ اَب رحمے کی پوری کائنات چودھری، ایک کمرہ، ایک چارپائی اور ایک سسکتا ہوا بلب تھا۔ یہ بلب اس نے کبھی تبدیل نہیں کیا۔ اس کی سسکیاں اسے اچھی لگتی تھیں۔ بلب کی تڑپ کی وجہ سے کمرے میں روشنی اور اندھیرا ساتھ ساتھ بستے تھے۔ اس کی زندگی کی طرح۔ صبح پو پھوٹتے ہی وہ چوہدری کی حویلی چلا جاتا۔ سارا دن اس کے کاموں میں مصروف رہتا۔ رات ڈھلے واپس آتا اور اگلے دن کا قصد کر کے چند گھنٹوں کی موت سو جاتا۔ بس یہی زندگی تھی۔ نہ کوئی بڑا مقصد نہ خواب۔ ہاں آرزو تھی۔ اپنی زمین کی، عزت کی، پہچان کی۔ اولاد بھی پہچان ہوتی ہے، نام زندہ رکھتی ہے۔ لیکن اگر وہ بھی نا ہنجار نکلے تو پھر۔ تو یوں کہیے کہ یہ آرزو ہی اس کی اولاد تھی اور اس کی زندگی کا مقصد۔ چوہدری کو بھی یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی اور وہ اس کا برا نہ

منا تا بس ٹال دیتا۔

سو ایسے ہی ہر دن کی طرح۔ وہ آج بھی اپنے کمرے میں واپس آیا اور بلب جلا کر اپنی چارپائی پر آن بیٹھا۔ اَب اسے عشا کی اذان کا انتظار تھا۔ اذان سن کر نماز پڑھے بغیر سو جانا اس کا خدا سے شکوہ کرنے کا اپنا انداز تھا۔ اذان شروع ہوئی اور وہ لیٹ کر اندھیرے اور روشنی میں غلط ملط ہوتی چھت کو گھورنے لگا۔ پھر اندھیرا ہو گیا۔

رحمے اٹھ جلدی کر چوہدری صاحب بلا رہے ہیں۔ دروازے پر زور کی دستک اور بلند آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی کے باہر تو اندھیرا تھا۔ ابھی تو پو بھی نہ پھوٹی تھی۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور جلدی سے دروازہ کھولا۔ دروازے پر ایک اور نوکر کھڑا تھا۔

کیا بات ہے پھتے؟ اتنی جلدی؟ سب خیر ہے؟

مجھے معلوم نہیں۔ چوہدری صاحب نے بلایا ہے۔ جلدی کر۔

اچھا تو چل میں آتا ہوں۔

نہیں میرے ساتھ چل۔ چوہدری کا حکم ہے۔

اچھا چل میں جوتا پہن لوں۔

وہ دونوں جلدی جلدی حویلی کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ وہ جب چوہدری کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں دو اور لوگ بھی موجود تھے۔

سلام چوہدری صاحب۔ اللہ کا شکر ہے آپ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔

سب خیر ہے۔ بیٹھ۔ یہ دونوں ساتھ والے پنڈوں کے نمبردار ہیں۔ انہیں میں نے ہی بلایا ہے۔ اچھا اَب میری بات غور سے سن۔ میں نے کل تیری باتوں پے بڑا غور کیا۔ تو نے جو یہ زمین کی رٹ لگا رکھی ہے۔ اس کا میں نے ایک حل سوچا ہے۔ پر پہلے تو مجھے یہ بتا کہ تجھے زمین چاہیے کیوں۔ اپنی ذات کے لیے یا دکھاوے کے لیے؟

کیوں کیا میرا یہ حق نہیں ہے کہ لوگ میری عزت کریں، مجھ سے مدد مانگیں، میری چاکری کریں۔

میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ تجھے زمین لوگوں کے لیے چاہیے اپنے لیے نہیں۔

نہ دینے کے بہانے ہیں صاحب۔ صبح صبح بلا کر بے عزت کر رہے ہو۔

نہیں آج تجھے کچھ دینے کے لیے ہی بلایا ہے۔ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے ہم چاروں دریا کے ساتھ والی زمین پر چلیں گے۔

چاروں کیوں صاحب۔

گواہ نہیں چاہئیں؟ قانونی معاملہ ہے۔

صاحب آپ زمین میرے نام کر رہے ہیں؟ وہ بھی دریا کنارے والی۔اس کی آواز میں لرزش تھی اور بے یقینی بھی۔

صبر کر۔وہاں جا کر بتاتا ہوں۔چوہدری اٹھ کھڑا ہوا۔

رحمے نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولا''صاحب آج گھٹنے کے درد کو کیا ہوا؟''

چوہدری مسکرایا اور بولا''شاید کوئی اچھا کام کرنے لگا ہوں۔''

جب وہ دریا پر پہنچے تو ابھی اندھیرا تھا۔فجر کی اذان ابھی نہیں ہوئی تھی۔ اندھیرے کی چادر چاک ہونی ابھی باقی تھی۔وہ چاروں کار سے نکل کر ایک پگڈنڈی پر آن رکے۔دھیمے پڑتے اندھیرے میں کچی مٹی کی مہک، لہلہاتی فصلوں کی سرگوشیاں، نالے میں سرکتے پانی کی سرسراہٹ، صبح صادق کو صدائیں دیتے حشرات کی آہ وزاری، پہاڑوں سے آئے مسافر کی مانند جو، سمندر سے ملنے کو بے تاب ہو،

دریا کا ارتعاش سے لبریز سکوت، ہوا اور پتوں کی جھنکار، دور کہیں ٹمٹماتا ہوا دیا اور رحمے کی امید، ہر شے ہی محوِ رقص تھی۔

ایسے میں چوہدری کی بھاری آواز نے بولتا سکوت تار تار کر دیا۔

غور سے سن کہ تو نے کرنا کیا ہے۔ رحماں فوراً چوہدری کی طرف متوجہ ہوا۔

ابھی اندھیرا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں پو پھوٹے گی، دن چڑھے گا تو سب کچھ صاف نظر آئے گا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تجھے زیادہ وقت دوں۔ یہ جہاں ہم کھڑے ہیں۔ یہ نقطہ آغاز ہے۔ یہاں سے سیدھا چلتا جا۔ تیرے پاس غروب آفتاب تک کا وقت ہے۔ تجھے چوکور چکر کاٹ کر واپس یہیں پر آنا ہے۔ جتنی زمین کے گرد تو چکر کاٹے گا وہ تیری۔ ہاں، غروبِ آفتاب پر تیرا اس مقام پر ہونا لازم ہے۔ اس پر کوئی بحث نہیں۔ اگر دن کو حصوں میں بانٹ لے اور لالچ نہ کرے تو کوئی مسئلہ نہیں۔

کیا چوہدری صاحب۔ یہ کیا بات ہوئی۔ خیرات بھی دیتے ہو تو شرطوں کے ساتھ۔

تو خوددار شخص ہے۔ پہلے کبھی خیرات لی ہے جو اَب امید رکھتا ہے۔ ان باتوں میں تو نے اپنا ہی وقت برباد کیا ہے۔ اب بھی چل دے ورنہ دیر ہو جائے گی۔ معاملہ بھی تیرا ہے اور فیصلہ بھی تیرا، میں یہاں انتظار کر رہا ہوں اور یہ دونوں ہماری بات

کے گواہ ہیں۔

آج تک تو محنت سے کچھ ملا نہیں، لیکن آج پیٹھ دکھاؤں تو اپنا ہی راہ زن ہو جاؤں۔ یہ خوشی تو آپ کو نہیں دوں گا چوہدری صاحب۔ یہ کہا اور رحماں سیدھی جاتی پگڈنڈی پر چل دیا۔

شبنم میں دھلی مٹی کی سوندھی خوشبو اور میٹھی ہوا کے جھونکوں نے اس کے قدموں میں برق بھر دی۔ وہ فراٹے بھرتا چلتا گیا۔ ابھی تو دن چڑھا بھی نہ تھا اور اس کے قدموں نے کچھ حصہ زمین اپنے نام لکھوا بھی لی تھی۔ اس کی پتلی پتلی ٹانگیں چابک بن کر زمین پر پڑتی رہیں اور وہ چلتا گیا۔ خوشحالی، عزت اور روشن مستقبل کے خواب سراب بن کر اس کی آنکھوں میں تیرتے رہے اور وہ چلتا رہا۔ پو پھوٹی، آسمان سیاہ سے سمندر ہو گیا اور وہ چلتا رہا۔

جتنا فاصلہ میں نے اَب تک طے کر لیا ہے، یہ حصہ میں اپنے بیٹے کے نام کر دوں گا۔ پھر وہ میری قدر جانے گا۔ پہلے بھی جو تھا اسی کو دے دیا پھر اس نے میری قدر کیوں نہیں کی۔ اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور قدموں میں جھول آیا۔ مگر وہ سنبھل گیا اور چلتا رہا۔

ساری زندگی لوگوں کو خوش کرنے میں گزار دی۔ لیکن جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر مجھے خوش کرنے آئی، اس کو وقت ہی نہ دے سکا۔ اور پھر اس کا وقت اسے لے گیا۔ یہ

زمین کا ٹکڑا بیچ کر اس کا شاندار مقبرہ بنواؤں گا۔ ایک اور آنسو۔ ایک اور جھول۔ مگر اس بار ضیاع کا احساس اس قدر شدید تھا کہ ہچکی بندھ گئی۔ اور قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ ایک لمحے کو رکا اور پھر کسی نئے جذبے سے چل دیا۔

اس سارے قصے میں، میں بھی تو ہوں، میری خواہشات کا کیا؟ آج مجھے بھی خودغرض ہو کر سوچنا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں گورے "Me Time" کرنا ہے۔ میں چلوں گا، اپنے لیے، اپنے وقار کے لیے، اپنے مقام کے لیے۔ اس کے قدم تیز ہو گئے اور سورج کو بھی اس کے عزم کی بھنک پڑ گئی، وہ اور حدت سے جلنے لگا۔

میرا خیال ہے اَب مجھے مڑ جانا چاہیے۔ اتنا حصہ بہت ہے۔ جہاں کچھ نہ تھا وہاں تو یہ بہشت ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دور چوہدری ایک دھبے سا نظر آ رہا تھا۔ ابھی تو چوہدری بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا۔ میں کن چکروں میں پڑا ہوں۔ وہ بوجھل آواز میں بڑبڑایا۔ اچھا جونہی چوہدری نظروں سے اوجھل ہو گا میں مڑ جاؤں گا۔

سورج کی حدت بڑھتی جاتی تھی اور اس کا پسینے میں شرابور جسم ابھی اپنے مالک کی ایما پر آگے بڑھتا جاتا تھا۔ ذرا سی بلندی اور پھر پستی آئی اور چوہدری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ رحمے نے بھی اپنا رخ موڑ لیا۔

جب رخ بدلا تو ہوا کا رخ بھی بدل گیا۔ اَب گرم ہوا کے تھپیڑے اس کے

چہرے کو جھلسانے لگے مگر منزل کے تصور نے اس کی ہمت بندھائے رکھی اور وہ چلتا رہا۔ کہیں مٹی گیلی تھی تو اس کے قدموں کے نشان رہ گئے، کہیں دھول پر پڑے تو مٹی کے ذروں میں ذرا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ دھول چھن سی اڑی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کچھ ہوا ہو اور پھر سب ساکت ہو گیا جیسے کبھی کچھ نہ ہوا ہو۔

سورج اَب سوا نیزے پر آ گیا اور رحمے کے قدموں میں ارتعاش آنے لگا۔ ابھی تو آدھا سفر بھی نہ کٹا تھا۔ شبنم بجھ چکی تھی اور زمین حدت اگل رہی تھی۔ ایسے میں اسے ایک سایہ دار درخت نظر آیا۔ اس نے سوچا کہ کچھ دیر رک کر سانس لے لوں۔ کچھ توانائی سمیٹ لوں تو پھر چل دوں گا۔ پھر یہ سوچا کہ درخت کی ٹھنڈی چھاؤں، ہریالی کا سکون اور ہوا کی شائستگی اسے کمزور نہ بنا دے۔ آغوش کسے اچھی نہیں لگتی۔ لیکن دھوپ سے چھاؤں اور پھر چھاؤں سے دھوپ کا سفر صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ بس اسی ڈر سے کہ یہ پرسکون آغوش اسے منزل سے نہ بھٹکا دے، وہ چلتا رہا۔

سورج نے اَب واپسی کا سفر شروع کر دیا تھا۔ اشارہ تو تھا کہ آدھا وقت گزر گیا، اَب واپسی کی فکر کرو۔ لیکن خواہشات کو کون سمجھائے۔ اس نے سوچا کہ جتنا سیدھا چلا تھا اتنا تو بائیں چلنا ہی چاہیے۔ تب تو مقصود چوہدری کو پیچھے چھوڑنا تھا۔ اَب کس آرزو کو منزل بنایا جائے۔

دور دھندلکے میں اسے ایک پھلدار درخت نظر آیا جس پر خوب نکھار آیا تھا۔ لو کے تھپیڑے اس کے جوبن کے آگے بے بس تھے۔ سبز پتے اور پھلوں سے لدی

ڈالیاں،مخروطی ٹہنیاں اور زمین پر شان سے کھڑا تنا ایک اور ہی دنیا کا پتا دیتے تھے۔

رحمے نے فیصلہ کر لیا کہ یہ درخت تو اس کی زمین کا حصہ اور اس کی ملکیت بن کر رہے گا۔سو وہ چلتا رہا۔پھر وہ درخت آ گیا۔

وہ اپنے ہیولے سے کہیں زیادہ خوشنما،خوشبودار،اور پرشکوہ تھا۔رحماں اپنے آپ کو اس دل فریب اور ٹھنڈی آغوش میں جانے سے نہ روک سکا اور اس کی چھاؤں میں نہا گیا۔چلچلاتی دھوپ جیسے اس کی فصیلوں تک آ کر ٹھہر گئی۔رحمے کا جی چاہا کہ تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جائے۔سانس لے لے،کچھ پھل کھا لے،کچھ زادِراہ اکٹھا کر لے۔پانی نہ سہی پھلوں کا عرق چکھ لے۔

لیکن منزل تو دھوپ میں تھی۔اس نے سوچا کہ جب یہ خوشنما درخت بھی اسی زمین کا ہی حصہ ہے تو زمین ہی زیادہ اہم ہوئی۔اس نے درخت کے تنے کو پیار سے چھوا اور سرگوشی میں بولا،''تم اَب میری ملکیت ہو۔ایک دن ہی کی تو بات ہے۔میں لوٹ کر آؤں گا اور پھر تمہیں مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکے گا۔'' درخت بس خاموش رہا اور رحمے نے رخ موڑ لیا۔

عصر کا وقت ہو چلا تھا۔اَب تو غلطی کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔وقت کم،مقابلہ سخت،ڈھلتا سورج اور منزل دور۔راستے میں لہلہاتے کھیت،بنجر،سیم زدہ زمین، بوٹیوں سے اٹی پگڈنڈیاں،لوحہ خوان سروٹے،اپنی مستی میں مگن مویشی اور بلوں میں

روپوش ہوتے حشرات آئے اور گزر گئے۔ رحماں اسی گماں میں کہ آج دن ڈھلنے پر یہ سب اس کا ہوگا، چلتا رہا۔

مال و متاع کے اس سراب میں اسے اپنے کمزور پڑتے قدموں، سوکھ کر کانٹا ہوتے حلق اور پسینے سے دھندلاتی آنکھوں کا خیال نہیں آیا۔ منزل کو پانے کے لیے قربانیاں تو دینی پڑتی ہیں۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔ وہ خود سے ہم کلام رہا اور چلتا رہا۔ اور پھر بائیں جانب اسے چوہدری کا دھندلا ہیولا نظر آنے لگا۔ اَب وقت تھا کہ وہ اپنا رخ پھر موڑ لے۔ لیکن اس نے حساب کیا کہ اگر وہ سو قدم گن کر اور چلے تو اس کے حصے میں کتنی زمین کا اضافہ ہوگا۔ اس نے سوچا کہ اتنے سے لالچ کا تو وہ حقدار تھا۔ سو چلتا رہا۔

وقت بہت بے رحم ہے۔ اسے کسی کی مجبوری، ضرورت، محنت یا ہمت سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ تو بس گزر جاتا ہے اور واپس نہیں آتا۔ قانونِ قدرت ہے۔

سورج اَب کچھ زیادہ ہی تیزی سے غروب کی طرف رواں دواں تھا۔ عجیب قصہ ہے۔ طلوع آفتاب سے لے کر ظہر تک ایسے لگتا ہے کہ دن کبھی ختم نہیں ہوگا۔ روشنی یوں ہی پھیلتی رہے گی۔ حرارت یوں ہی بنی رہے گی اور قسمت کا ستارہ یونہی بلندیوں کو چھوتا رہے گا۔ ظہر سے عصر تک کے وقت میں سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں کہ بات وہ نہیں رہی۔ دوسری جانب کا سفر شروع ہوا۔ روشنی برقرار رہتی ہے لیکن حدت ماند پڑ جاتی ہے۔ عصر سے مغرب تو جیسے ایک ہیولا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سورج کو ڈھلنے

کی جلدی ہے۔طلوع کے وقت کی تاریکی میں سرخ رنگ کی جھانکتی روشنی سے لے کر غروب کی سرخ روشنی کے تاریکی میں دفن ہونے تک سفر ہر بار کٹتا ہے۔اَب کوئی نہ سمجھے تو قصور کس کا ہے۔

چوہدری کے ہیولے کا روپ اَب نکھرنے لگا تھا۔روشنی بھی ماند پڑنے لگی تھی۔ میں وقت سے پہلے منزل پر پہنچ جاؤں گا۔رحماں کمال بے نیازی سے گویا ہوا۔اَب منزل دور نہیں۔جس خواہش کو تمام عمر سرہانے تلے رکھ کر سویا آج وہ حقیقت بننے کو ہے۔رحمے کی روح مچل رہی تھی۔لیکن روح تو لافانی ہے۔اس پر تو وقت لاگو ہی نہیں ہوتا۔ہاں مگر جسم،اُس کی بات اور ہے۔

رحمے کو تھکاوٹ اور پسینے سے الجھن ہونے لگی۔سر پر رکھی پگ اور پچھلی عید پر سلوایا کرتہ بوجھ لگنے لگے۔پھر ایک جھٹکے سے اس نے انہیں اتار پھینکا۔بس ایک چادر رہ گئی سَتر چھپانے کو۔لڑکھڑاتے قدموں سے وہ آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

سورج کی آخری کرنوں میں چوہدری واضح نظر آنے لگا۔بس ذرا سی ہمت اور اور پھر سب تمہارا۔اس نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر اسی لمحے اس کی دائیں پنڈلی ایسے اکڑ گئی جیسے لکڑی کی بنی ہو۔درد کی شدت سے رحماں وہیں بیٹھ گیا۔ چوہدری کا عکس اس کی آنکھوں میں تیرنے لگا۔آج نہیں۔وہ تڑپ کر اٹھا اور ایک آہ کے ساتھ پھر بیٹھ گیا۔فاصلہ کم رہ گیا تھا۔اس نے باقی ماندہ ہمت سمیٹی اور کہنیوں کے

بل رینگنا شروع کر دیا۔ کبھی خراش آئی، کبھی کانٹا چبھا کبھی کچھ اچک کر آنکھ میں آ گرا لیکن وہ رینگتا رہا۔ اَب وقت کا گرداب اور اس کی کہنیاں مدمقابل تھیں۔ چند قدموں کی تو بات تھی۔ لیکن سورج ڈوب گیا اور وقت ختم ہو گیا۔ اس کی ڈوبتی سانسیں زمین پر گرد اڑانے لگیں۔ پھر بصارت نے وداع کہا۔ سماعت کی لڑی ٹوٹ رہی تھی کہ اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر چوہدری کی آواز، ''یہاں ایک قبر کھودو اور اسے دفنا دو۔ بس اسے اتنی ہی زمین درکار تھی۔'' رحمے کے چہرے پر کسی بہت بڑے راز کے افشا ہونے کا سکوں تھا لیکن دیر سے۔ وقتِ قضا آ چلا تھا۔ آخری ہچکی سے پہلے اس نے جو آخری آواز سنی وہ موذن کی اذان تھی جو ہمیشہ کی طرح اسے بلا رہا تھا۔ اس نے اپنے جسم میں جنبش محسوس کی اور آنکھیں کھول دیں۔ سسکتے بلب کی تھرکتی روشنی میں اس کے کمرے کی چھت غلط ملط ہو رہی تھی۔